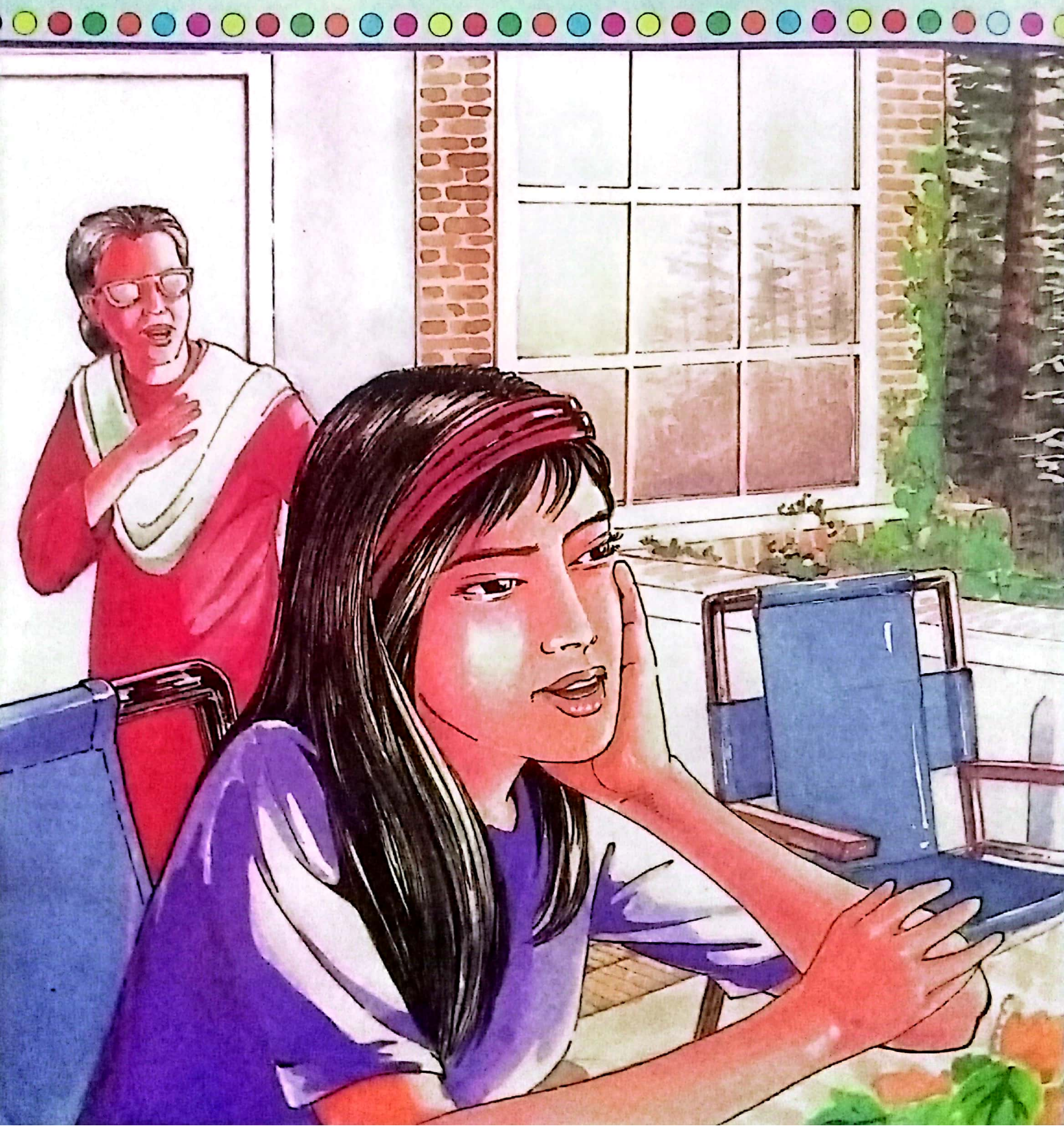
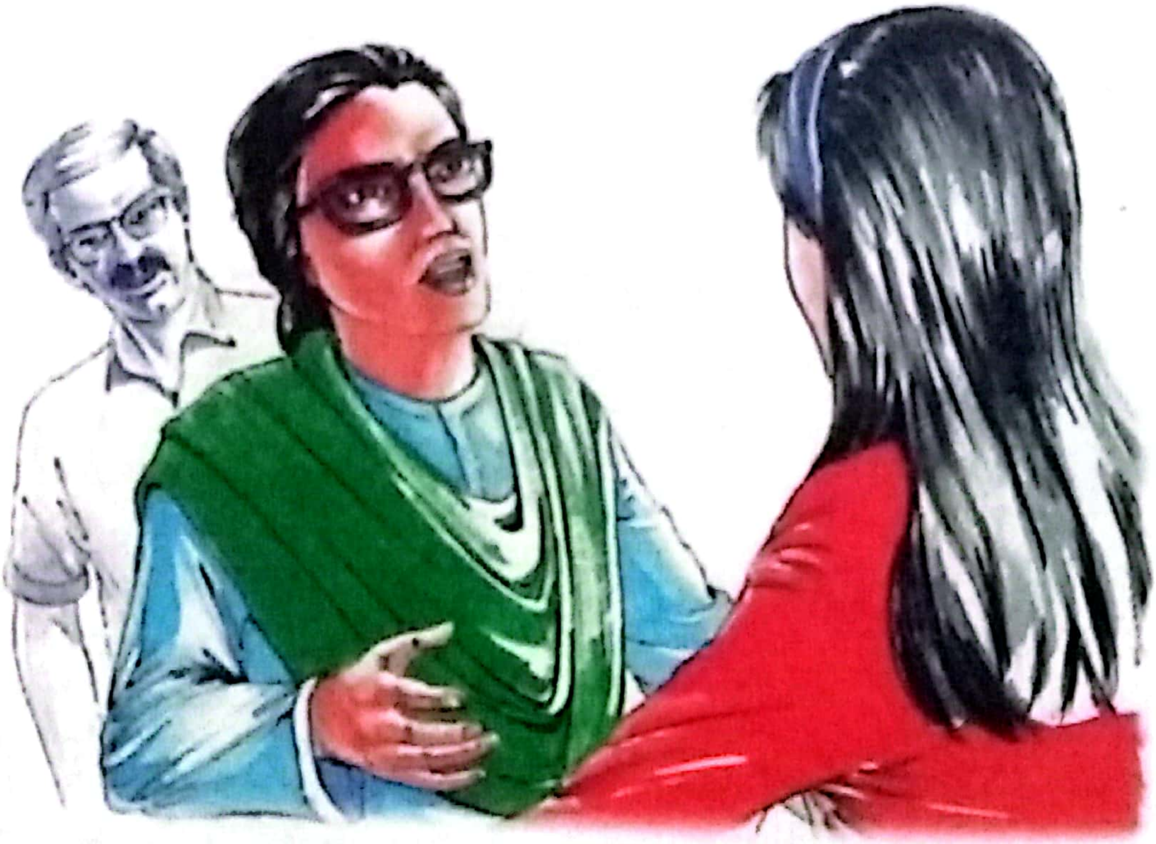
فرح



فَرح



زوہیر علی شریف

''اسلام آباد کی سب سے اچھی بات، اس کا موسم ہے۔'' فرح نے سوچا۔
''پہلے وہ سب کراچی میں رہتے تھے اور وہاں سارا سال موسم ایک سا ہی رہتا تھا۔
''یہاں اسلام آباد میں!'' فرح نے دل میں کہا۔ ''چار راتیں صاف ہوتی ہیں۔
ابھی یہ لگ رہا ہوتا ہے کہ گرمی شاید کبھی ختم نہ ہو گی کہ ہوا میں سرسراتی خنکی چپکے سے یہ کہہ جاتی ہے، خزاں آ گئی۔''

فرح کرسی پہ بیٹھی، مارگلہ کی شاداب پہاڑیوں کا منظر دیکھ رہی تھی۔
''کیسا پیارا لگ رہا ہے۔'' اُس نے ہزاروں بار کی طرح، پھر ایک بار وہی سوچا۔
کانچ کا سا نیلا آسمان، اور رات کی بارش کے بعد اور بھی مہکی ہوئی ہوا۔
کچھ درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور دوسروں کے پتوں کا رنگ سنہری مائل بھورا ہو چلا تھا۔ طوطوں کی ایک ڈار کہیں سے ٹیں ٹیں کرتی گزر گئی۔

ہفتہ کا دن تھا۔ فرح مزے سے کتاب پڑھ رہی تھی۔ یہ کتاب جنگلی جانوروں اور ان کی عادتوں کے بارے میں تھی۔ جانوروں کا اسے جنون تھا۔ اس کے پاس تین بلیاں تھیں اور کوئی درجن بھر ہریل طوطے تھے۔ اس کا جی تو ایک کتا پالنے کو بھی چاہتا تھا مگر اس کے اماں ابا کسی طرح نہ مانتے تھے۔ بلیاں پالنے کی اجازت بھی ہزار حیل وحجت کے بعد ملی تھی۔ ان میں سے دو تو سڑک پر گھومتی ملی تھیں۔ اور اس کی اماں ان دونوں کو نکالنے کے درپے تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی بدشکل بلیوں کو گلیوں میں ہی آوارہ پھرنا چاہیے۔ مگر فرح کو تو اپنی سب بلیاں پیاری تھیں۔ یہ آوارہ بلیاں بھی تو آخر خدا کی مخلوق تھیں۔



اچانک اماں کی شکوے شکایت کرتی آواز زور سے آئی، فرح چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکل آئی۔ ''یہ بلب پھر فیوز ہوگیا۔'' اس کی اماں کی آواز سنائی دی۔ ''اب اُن کے ابا کے آنے تک انتظار کرنا پڑے گا کہ یہ بدلا جا سکے۔ اگر کہیں میرا بیٹا ہوتا۔۔۔'' فرح نے اماں کو یہ سب کچھ کہتے سنا، بدمزہ ہو کر اس کی بھنویں تَن گئیں۔

جب سے اسے یاد تھا، اس کی اماں اس بات سے رنجیدہ تھیں کہ اُن کے صرف بیٹیاں تھیں اور کوئی بیٹا نہ تھا۔ سب کا خیال تھا کہ پہلوٹھی کا بیٹا ہوگا۔ چند سال بعد جب اس کی چھوٹی بہن پیدا ہوئی تو سب لوگ سچ مُچ روئے تھے۔ ایک بیٹی اور! اور تب سے آج تک دونوں بہنیں یہی سنتی آئی تھیں کہ گھر میں کوئی لڑکا نہیں ہے۔

یہ بھی نہیں تھا کہ ماں باپ نے بیٹیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا ہو، لیکن یہ بات کہ وہ لڑکیاں تھیں لڑکا نہیں تھیں انہیں بار بار جتائی جاتی تھی۔

''امی بلب بدلنے کے لئے آپ کو بیٹے کی ضرورت نہیں۔'' فرح نے زور سے کہا۔

''یہ تو میں بھی کر سکتی ہوں۔''

''اور پھر تمہیں بجلی کا جھٹکا لگ جائے۔'' اُس کی اماں نے تُرشی سے کہا۔

''نہیں بھائی نہیں، بڑی مہربانی۔ تمہارے ابا کے آنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔''

اس پہ فرح نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اماں کو بتائے بغیر چپکے سے بلب بدل دے گی۔ ذرا سا تو کام تھا۔ ایک بلب بدلنے کے لئے مرد ہونا ضروری نہیں۔ اس کی سمجھ میں اپنی ماں کی باتیں نہیں آتی تھیں۔

آخر وہ خود بھی تو ایک عورت تھیں۔ پھر انہیں بیٹیوں کا ہونا اتنا برا کیوں لگتا تھا؟

مگر اس نے سوچا ہمارے ملک میں بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں کی خواہش تو ایک عام بات تھی۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں اور بیٹے سرمایہ۔

کیسی واہیات بات ہے۔ اگر بیٹیاں نہ ہوا کریں تو بیٹوں کی مائیں کون ہوا کریں گی؟

فرح کا پکا ارادہ تھا کہ ایک دن وہ یہ ثابت کر کے چھوڑے گی، اور خاص طور پر اپنی اماں کے لئے کہ بیٹیاں اگر بیٹوں سے اچھی نہیں ہوتیں تو ان جیسی ضرور ہوتی ہیں۔

''آپی!'' اس کی چھوٹی بہن اپنے کمرے سے اُسے پکارتی آئی۔

''مجھے ایک کہانی سنا دو، میرا جی نہیں لگ رہا۔''

''اچھا بس ذرا سا ٹھہر جاؤ۔'' فرح نے کہا۔ پھر دھیمی آواز میں بولی۔

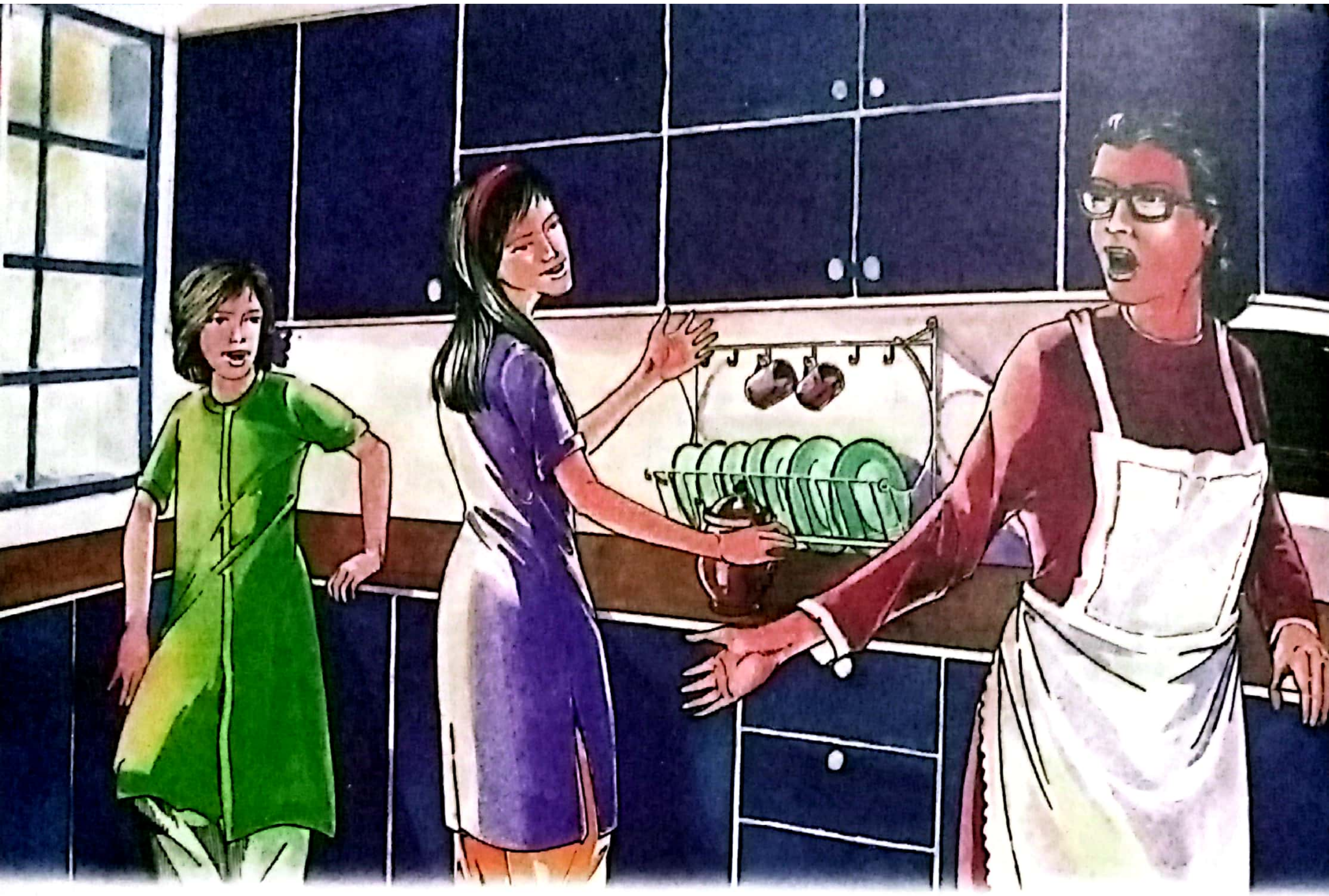
''میں ذرا مردوں کا سا ایک کام کر آؤں۔''

بہن کی بات کو جاننے کی دُھن میں سارہ بھی اس کے پیچھے اندر کو ہو لی۔
ٹی وی لاؤنج میں فرح نے سارے سوئچ جلائے بجھائے تاکہ پتہ چل سکے کہ کون سا بلب فیوز تھا۔ ایک دراز میں اُسے نیا بلب بھی مل گیا۔ اُس نے فیوز بلب کے نیچے ایک کرسی رکھی۔ سارہ نے کرسی کو تھاما اور فرح اس پر چڑھی۔ ہولڈر تک ہاتھ لے جانے کے لئے وہ پنجوں کے بل کھڑی ہوئی، اور پلک جھپکتے میں بلب بدل دیا۔ ابھی اس نے کرسی ٹھکانے پر واپس رکھی اور خراب بلب کو کوڑے کی ٹوکری میں ڈالا ہی تھا کہ اس کی اماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔
''بچیو! یہاں آکر ذرا میرا ہاتھ بٹاؤ۔ کراچی سے کل تمہاری خالہ آرہی ہیں۔ ابھی ڈھیروں کام کرنے کو ہیں۔''

دونوں لڑکیاں بڑے سعادت مندی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔
پچھلے ایک ہفتہ سے سارا وقت کراچی سے خالہ کے آنے کی تیاری میں گزر رہا تھا۔
ان کی خالہ 'بیگم اسماعیل' بیوہ تھیں اور پہلی دفعہ اسلام آباد آرہی تھیں۔
اُن کے ساتھ اُن کے بچے آرہے تھے۔ بیٹا، عامر، فرح سے تین سال بڑا تھا۔
اور بیٹی نازش فرح کی ہم سِن تھی۔

''جی، بیگم دُرّانی'' فرح نے اپنی اماں کو مذاق میں تکلف سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا حکم ہے سرکار؟''
''مہمان خانہ تیار ہے؟'' بیگم دُرّانی نے پوچھا۔
''بالکل ویسے ہی جیسے کہ ہونا چاہئے۔'' فرح نے چہکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس کی اماں نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ خوب جانتی بوجھتی ہوں اور بولیں۔
''مہمانوں کے لئے غسل خانے میں نیا صابن رکھا ہے؟''
''امی، وہ بھی ہے۔'' فرح نے ایک گہری سانس لی۔ ''دُھلے ہوئے تولیے بھی رکھے ہیں۔'' سارہ بھی چہک کر بولی۔
''پریشان نہ ہوں۔'' فرح نے اپنی ماں سے کہا۔ ''سب کچھ ہو گیا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی کسر رہ بھی گئی، تو کیا ہو جائے گا۔ آخر ہماری خالہ ہی آ رہی ہیں۔ آپ کی اپنی بہن، ملکہ برطانیہ تو نہیں۔''
''میرے لئے وہ ملکہ برطانیہ سے کم نہیں۔'' امی نے تنک کر جواب دیا۔ تم جانتی ہو کہ وہ کس طرح ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن پر تمہارا بہت اچھا اثر پڑے۔''
''وہ کس لئے؟'' فرح نے پوچھا۔ ''کیا وہ ویٹرنیری کالج میں میری تعلیم کے اخراجات اٹھائیں گی؟''
اس کی اماں نے آہستگی اور نرمی سے اعلان کرتے ہوئے کہا۔
''تم اپنی خالہ پر ایک اچھا اثر ڈالنا، تاکہ جب تم بڑی ہو تو وہ عامر سے تمہارا رشتہ کرنے کو رضامند ہوں۔''
''پھر وہی پرانا قصّہ، نہیں امّاں، پلیز۔'' فرح چڑ گئی۔
''اپنے آپ کو بھاگوان جانو۔'' اس کی اماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تم سترہ برس کی ہو، اور تمہارا مستقبل ابھی سے طے ہو گیا ہے۔ تم کیا جانو، ماں باپ کے دل کو بیٹیوں کی کیسی فکر لگی رہتی ہے۔ پتہ بھی نہیں لگتا اور لڑکیاں پچیس سے اوپر



ہو جاتی ہیں اور پھر کوئی بھی اُن سے بیاہ نہیں کرنا چاہتا۔ اب اپنی پھوپھی کو ہی دیکھو۔ تیس برس کی ہوگئیں وہ، اب ان سے کون شادی کرے گا؟''

فرح کو غُصّہ آگیا۔ ایسی باتوں سے اُسے نفرت تھی۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور کہا۔ ''اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ پھوپھی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ اپنا کیریئر بنانا چاہتی تھیں۔ اس وقت وہ ملک کی ایک مشہور وکیل ہیں۔''

ان کی ماں کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ ''چلو، گھر کا کام نمٹا دیں۔ تم ڈھنگ سے ان کی چائے کا انتظام کرو۔ مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ تمہاری خالہ اور بچوں کو مری لے جائیں۔''

اسی گھڑی دروازے کی گھنٹی بجی۔ درّانی صاحب دفتر سے لوٹ آئے تھے۔ فرح نے چائے کی ٹرے لگانا شروع کردی۔ سارہ دروازہ کھولنے کو لپک گئی۔

جتنی دیر میں ابا اپنے کمرے میں ہاتھ منہ دھونے گئے، فرح چائے کی ٹرے لے کر آگئی۔ کچھ ہی دیر میں اماں ابا اپنے کمرے سے لاؤنج میں آگئے۔ بیگم درّانی نے روشنی کے لئے سوئچ دبایا۔ ''عجیب معاملہ ہے۔ ذرا دیر پہلے میں نے یہ لائٹ جلانا چاہی تھی تو جلی نہیں۔ میں سمجھی بلب فیوز ہو گیا۔''

''شاید سوئچ میں کوئی گڑبڑ ہو۔'' اُن کے شوہر نے کہا۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ سارہ زور سے ہنس پڑی اور راز اگل دیا۔ ''اماں، بلب فیوز ہی تھا۔ آپی نے جھٹ پٹ بدل ڈالا۔''

''اور مجھے بجلی کا جھٹکا بھی نہیں لگا۔''

اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتیں فرح نے ٹکڑا لگایا۔

''جانتی ہو اسماء!'' درّانی صاحب بولے۔ ''تمہارے لڑکپن کے زمانے سے اب دنیا بدل گئی ہے۔ اب عورتیں ہر طرح کے کام کر رہی ہیں۔ آج ہی میں نے پڑھا کہ پی آئی اے میں ایک خاتون پائلٹ ہیں۔''

''کل ہماری مس نے ہمیں عظیم مسلمان عورتوں کے بارے میں بتایا تھا۔'' سارہ نے فوراً کہا اس معاملے میں کہیں وہ پیچھے نہ رہ جائے۔

''اب جو ہم عورتوں کے کارناموں کے موضوع پر بات کر رہے ہیں، بابا'' فرح نے اپنے ابا کی طرف مڑتے ہوئے کہا ''یہ میرا ڈرائیونگ سیکھنے کا وقت ہے۔ آج ہفتہ ہے، یاد ہے آپ کو؟''

پچھلے مہینے سے فرح ہر ہفتے کے دن کو اپنے ابا سے گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ڈرائیونگ سیکھنے کا لائسنس تھا۔ ہر ہفتے کی سہ پہر کو ابا اسے ایک گراؤنڈ میں لے

جاتے اور گاڑی چلانا سکھاتے۔ سارہ بھی ان کے ساتھ ہوتی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی وقفے وقفے سے مشورے دیا کرتی۔ جو زیادہ تر گاڑی کو تیز چلانے کے بارے میں ہوتے۔

''یہ ڈرائیونگ کا معاملہ کچھ زیادہ ہی نہیں ہوگیا؟'' بیگم درّانی نے سختی سے پوچھا۔

''سترہ برس کی ہی تو ہو، اتنی جلدی کیا ہے گاڑی چلانا سیکھنے کی؟ تمہارے ابا سلامت رہیں، ہمارے لئے گاڑی چلانے کو وہ کافی ہیں۔''

''اماں'' فرح نے اُلجھ کر کہا۔ ''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ میں شادی کے قابل اور سیانی ہوگئی ہوں۔ اب میں اتنی چھوٹی ہوں کہ ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتی۔ کیا خبر کب میری ڈرائیونگ کام آجائے؟ ذرا خیال کیجئے میں آپ کو کتنی بار بازار لے جاسکتی ہوں!''

''میں تو یہ سوچنا چاہوں گی کہ تم میرے بجائے کتنی بار کھانا پکا سکتی ہو؟''

اماں نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ ''لڑکیوں کے لئے یہ کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وہ ڈھنگ سے کھانا پکانا سیکھیں بجائے اس کے کہ گاڑی چلانا سیکھتی پھریں۔ اتنا ہمیشہ یاد رکھنا کہ شوہر کے دل تک راستہ پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔'' درّانی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

''مگر عورت دونوں کام کر سکتی ہے اسماء، گاڑی چلانا اور کھانا پکانا بھی۔''

یہ کہتے ہی انہوں نے چائے کی پیالی رکھی اور کھڑے ہوگئے۔

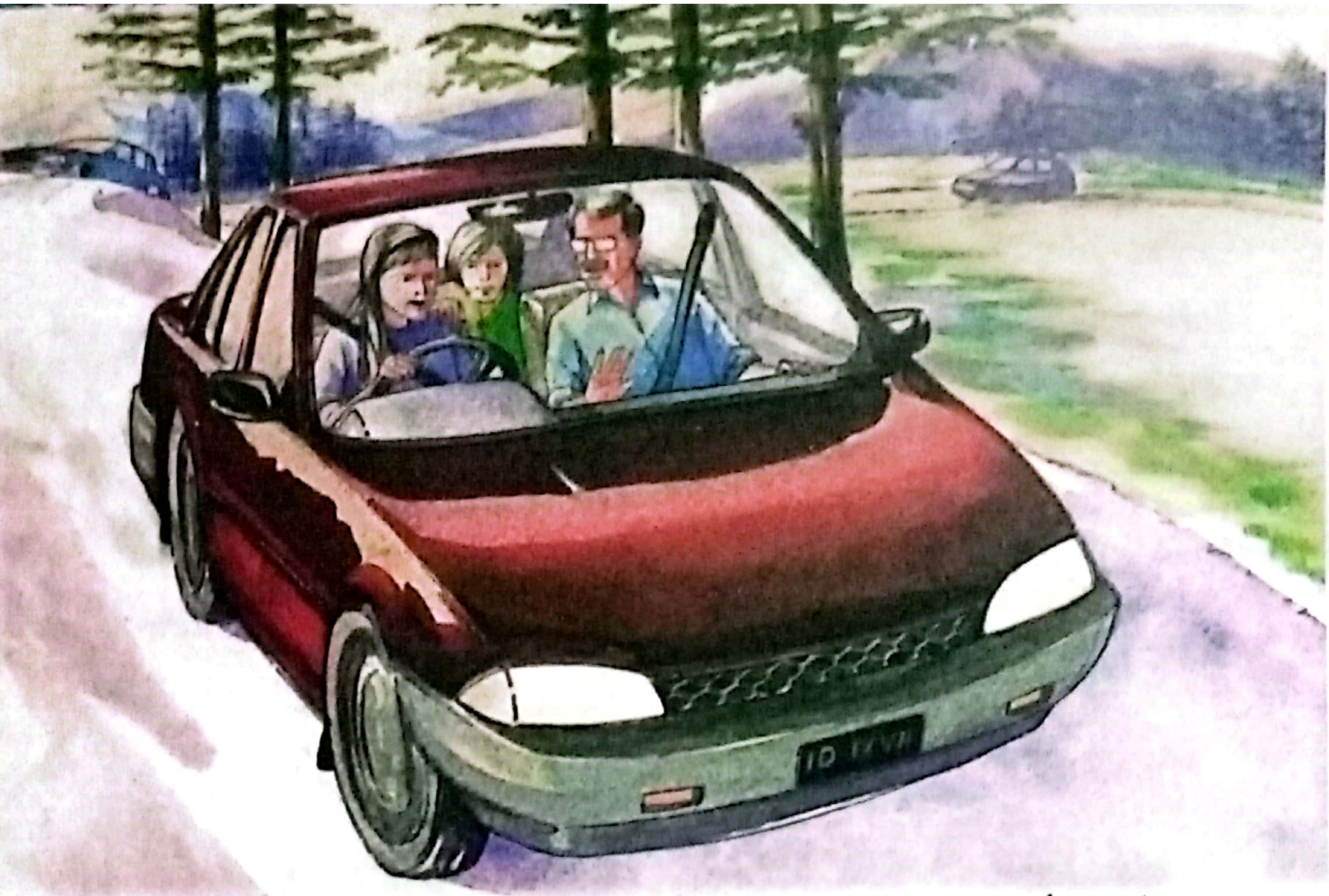
''آؤ، نوجوان خاتون۔'' انہوں نے فرح سے کہا۔

''دیکھیں آج تم آنکھیں بند کر کے گاڑی چلا سکتی ہو یا نہیں؟''

وہ مذاق کرتے ہوئے بولے۔
ابا اور دونوں بیٹیوں نے اماں کو خُدا حافظ کہا۔ وہ باہر پہنچے جہاں ان کی سوزو کی مارگلہ کھڑی تھی۔ درّانی صاحب ڈرائیونگ کی سیٹ پر بیٹھے اور فرح اُن کی ساتھ والی نشست پر۔

سورج نارنجی رنگ کے ایک بڑے گولے کی طرح افق پر ٹِکا ہوا تھا۔ پارک میں بہت سے لوگ جاگنگ اور کچھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ سبزے پر اِدھر اُدھر بیٹھے تھے اور بچے آس پاس کھیل کود رہے تھے۔ ایک طرف دو بچے ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز اُڑا رہے تھے۔ دور، کُھلے میدان میں، پارک کے بیچوں بیچ دو گاڑیاں آہستہ آہستہ چلتی بلکہ ڈولتی آ رہی تھیں۔ لگتا تھا ان پر بھی کوئی گاڑی چلانا سیکھ رہا تھا۔ اوپر بہت اوپر دو شکرے ہوا کی لہروں پر چکر لگا رہے تھے۔
فاصلہ پر ہونے کے باوجود فرح یہ جان گئی تھی کہ پرندوں کی نظریں زمین پر جمی خوراک کی متلاشی تھیں۔ جانوروں کے متعلق مطالعہ سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شکروں کی نظر دوربینی ہوتی ہے۔ گھاس میں چھپی ہوئی ایک چوہیا انہیں بلی جتنی بڑی نظر آتی ہے۔

گاڑی چلانے کی مشق کرتے ہوئے چالیس منٹ ہو گئے تو درّانی صاحب نے گھر واپس چلنے کا فیصلہ کیا جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر بہت خوش تھے کہ فرح بہت جلدی گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی۔ دل میں کہیں انہیں بیٹے کے نہ ہونے کا افسوس تھا، لیکن انہیں اس بات کا پختہ خیال تھا کہ لڑکیوں کو زیادہ سے زیادہ ہنر



سیکھنا چاہئیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لئے ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی زندگی صرف خانہ داری کرتے اور بچے پالتے گزر جائے۔ یہ بات عورتوں کے لئے لازمی ذمہ داری تھی، لیکن ان کی آرزو تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹیاں پیشہ ورانہ مہارت بھی رکھتی ہوں، اور اپنی زندگی کو خود بسر کرنے کے قابل ہوں۔

اگلے دن شام کو درّانی صاحب اپنی بیوی کے ساتھ اسلام آباد ایئرپورٹ گئے جہاں اُن کی سالی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔

فرح اور سارہ گھر پر ٹھہریں۔ اماں نے جاتے جاتے ڈھیروں کام آخری وقت تک نمٹانے کو بتا دیئے تھے۔

''تو آپی'' سارہ نے کھانے کی میز لگاتے لگاتے بہن سے کہا۔ ''کیا ہمارے خالہ زاد بہن بھائی بدل گئے ہوں گے؟ انہیں دیکھے بہت دن ہو گئے۔''

''میرا خیال ہے ضرور۔'' فرح نے جواب دیا۔ ''دیکھو، ہمیں اسلام آباد آئے آٹھ برس ہو گئے۔ تب سے ہم نے اُنہیں نہیں دیکھا اور تم تو اس وقت صرف دو برس کی تھیں۔''

''خدا کرے اُنہیں جانور اچھے لگتے ہوں۔'' سارہ نے کہا۔ ''ورنہ تم اُنہیں کس کی کہانیاں سناؤ گی؟''

فرح کو ہنسی آ گئی۔ ''بے وقوف، میں انہیں کہانیاں تھوڑا ہی سناؤں گی۔ وہ ننھے بچے تو نہیں ہیں، سمجھیں۔''

وہ پھر ہنسی اور کہنے لگی۔ ''پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ انہیں جانور اچھے لگتے ہوں۔ آخر کچھ دن تو وہ یہاں ٹھہریں گے اور انہیں ہماری بلیاں برداشت کرنا پڑیں گی۔''

دونوں بہنوں نے جلدی جلدی وہ سارے کام نمٹائے جو امّاں کہہ گئی تھیں۔ جیسے ہی وہ آخری کام ٹی وی کو دوبارہ سے جھاڑ پونچھ رہی تھی کہ گھنٹی بجی۔

''وہ لوگ آ گئے۔'' سارہ نے خوش ہو کر پکارا اور دروازہ کھولنے کو لپکی۔

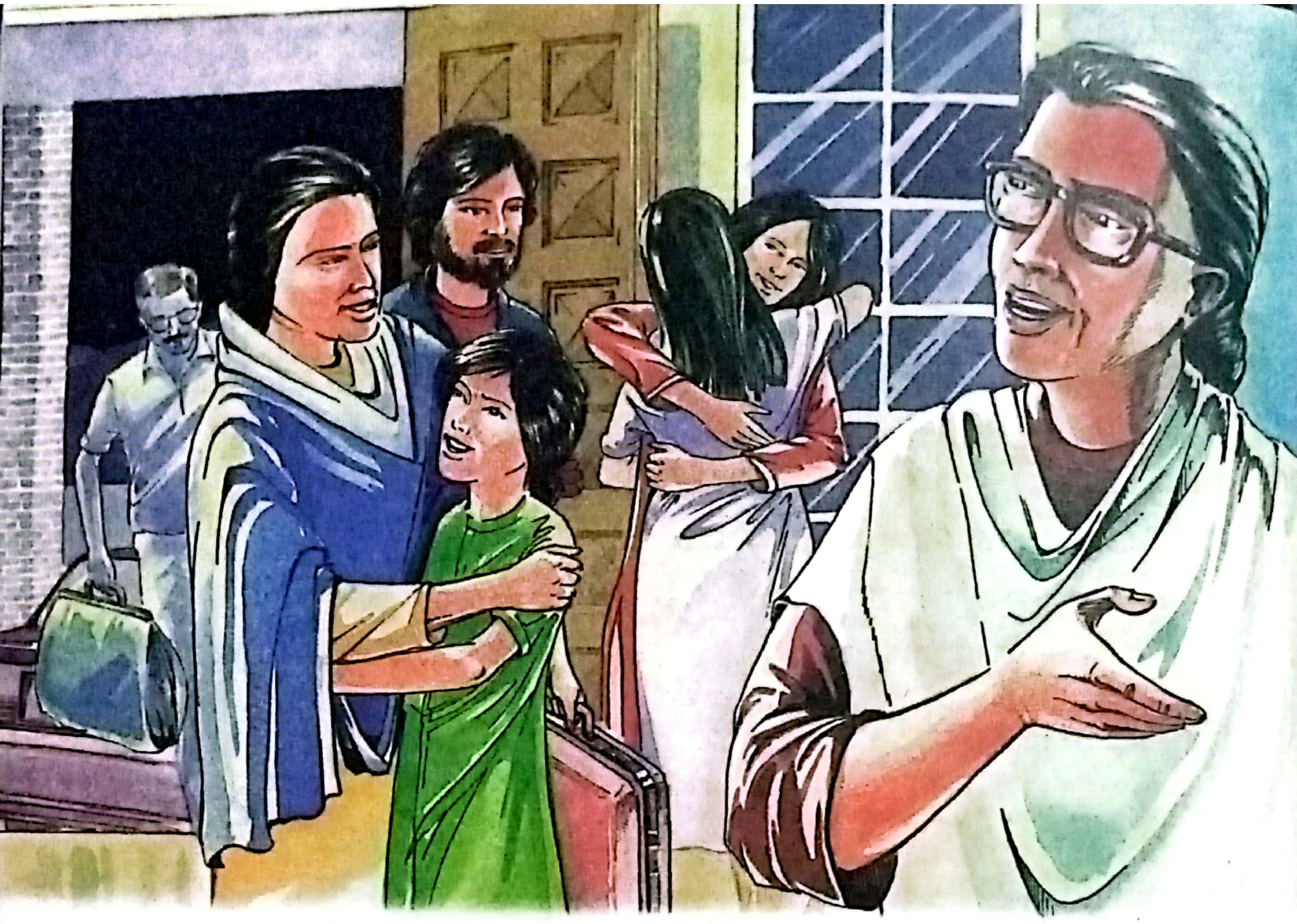
''ایک منٹ تو رُکو، میری تیز گام'' فرح بھاگ کر بہن کے پاس پہنچی۔

'' اماں نے بتایا نہیں کہ پوچھے بغیر دروازہ نہیں کھولتے۔''

''کون ہے؟'' سارہ نے بند دروازے کے پیچھے سے پوچھا۔

''ہم ہیں بچیو۔'' ایک نسوانی آواز آئی۔ یہ دونوں اس آواز سے مانوس نہیں تھیں۔ اتنے میں انہوں نے اپنے امّاں ابّا کی آواز بھی سنی اور جان گئیں کہ یہ آواز اُن کی خالہ کی ہو گی۔ فرح نے مسکرا کر دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے ایک باوقار خاتون کھڑی تھیں۔



اس کی ماں سے ان کی مشابہت ظاہر تھی۔ فرح کو خیال آیا کہ یہی اُس کی خالہ ہیں۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ بڑی عمر کی لگ رہی تھیں۔ خالہ کے پیچھے، فرح جتنی ہی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ یہ ان کی خالہ زاد بہن نازش تھی اور نازش کے پیچھے ایک سنجیدہ شکل والا لڑکا کھڑا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان کا خالہ زاد بھائی عامر تھا۔

''اوہ میرے اللہ!'' فرح نے سوچا۔ ''یہ تو واقعی بڑا ہو گیا۔'' اسے تو آٹھ برس کا ایک موٹا بھدا سا لڑکا یاد تھا، جس کا چہرہ مُہاسوں سے بھرا تھا اور اب اُس کے سامنے ایک لمبا، دبلا پتلا نوجوان کھڑا تھا۔ چھوٹی سی داڑھی، لمبے بال، سنجیدہ چہرہ۔

''کیا ہمیں اندر آنے دو گی، یا ساری رات یہیں کھڑے رہیں گے؟''

اس کی خالہ زاد بہن نازش نے خوش دلی سے پوچھا۔

''بھئی واللہ'' خالہ نے حیران ہو کر کہا۔ ''تم دونوں کتنی بڑی ہو گئیں!''
انہوں نے دونوں کو باری باری گلے لگا کر پیار کیا۔ فرح اور نازش بھی ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ نازش نے سارہ کو گلے لگایا اور پیار کیا۔
عامر ایک کونے میں کھڑا رہا اور دونوں بہنوں کو دیکھ کر جھینپ کر مسکرایا۔

''آپا، آیئے لاؤنج میں آجایئے۔'' بیگم درّانی نے بہن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''عامر میاں، تم میرے ساتھ آؤ۔'' درّانی صاحب نے عامر سے کہا۔
''چلو تمہیں تمہارے کمرے دکھادوں اور سامان بھی وہاں پہنچادیں!''
''اور نازش آپا، آپ ہمارا کمرہ دیکھ لیجئے۔'' سارہ اپنے دونوں ہاتھوں سے خالہ زاد بہن کو کھینچتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہمارے کمرے میں رہیں گی، عامر بھائی اور خالہ جان مہمان خانے میں ٹھہریں گے۔''

''اچھا! اب پتہ چلا، یہاں انتظام آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' نازش نے حیران ہو کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی اور اس نے اپنی چھوٹی خالہ زاد بہن کو اپنے آپ کو کھینچنے دیا۔ تھوڑی دیر میں دستر خوان لگ گیا۔
کچھ دیر تو اس بحث میں گزر گئی کہ میز کے سرہانے کون بیٹھے؟
بیگم درّانی کہتی تھیں کہ ان کی بہن کو بیٹھنا چاہیئے اور ان کی بہن کا اصرار تھا کہ یہ جگہ درّانی صاحب ہی کے لئے ہے۔
''میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' درّانی صاحب چہک کر بولے ''کوئی کہیں بھی بیٹھے، کھانا ایک سا ہی ملے گا۔ جہاں جی چاہے تشریف رکھئے، اور بسم اللہ کیجئے۔''

''یہاں کیسی خاموشی ہے۔'' نازش بولی۔ ''مجھے تو لگتا ہے نیند مشکل ہی سے آئے گی۔ کراچی میں تو ہر وقت ہنگامہ رہتا ہے۔''

''کیسی عجیب بات ہے۔'' سارہ نے کہا۔ ''مجھے تو شور میں نیند نہیں آتی۔ یہاں اسلام آباد میں بڑا سکون ہے اور چاہے کسی وقت بھی نیند آئے، صُبح کو ہمیشہ تازہ دم آنکھ کھلتی ہے۔ ہے نا آپی؟'' اس نے بہن سے اپنی بات کی حمایت کی نیت سے پوچھا۔

''ہمیں تازہ ہوا کی عادت ہی نہیں رہی۔'' خالہ بیچ میں بولیں۔ ''کہیں ہماری طبیعت ہی خراب نہ ہو جائے۔'' سب ہنس دیئے۔ کھانے کے دوران میں ایسی خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد لڑکیاں تو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ عامر اور ابا بڑے لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

کھڑکیاں کُھلی تھیں۔ شفاف آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ باغیچے سے رات کی رانی کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہیں دُور ایک اُلو بار بار بول رہا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی مگر رات پھر بھی خنک تھی۔

''تم کوئی گرم کپڑا پہن لو۔'' بیگم درّانی نے اپنی بہن سے کہا۔ انہیں یہ لگا جیسے ان کی بہن کو ٹھنڈ سے جُھرجُھری آ گئی ہو۔ ''میں شال لے کر آتی ہوں۔ ہمیں پت جھڑ کی خنک شاموں کی عادت نہیں۔'' وہ اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔

درّانی صاحب عامر کی طرف مڑے اور بولے۔

''بھئی عامر تم آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''میں کامرس کالج میں فائنل ایئر میں ہوں۔'' عامر نے جواب دیا۔

''اور پھر اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' درّانی صاحب نے پوچھا۔
''کچھ ملازمت وغیرہ کا سوچا یا نہیں؟''
عامر نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جیسے اُس بات کا جواب انہیں دینا چاہیئے۔
لیکن انہوں نے صرف بیٹے کی طرف دیکھا اور کچھ بولی نہیں۔
''نہیں میں نے ابھی اس بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے۔'' عامر نے آہستہ سے کہا۔
''اس وقت میں اپنے لئے سارے راستے کُھلے رکھنا چاہتا ہوں۔''
''زیادہ دیر کے لئے ایسا مت کرنا۔'' درّانی صاحب نے نصیحت کی۔
''وقت پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔ معلوم ہے ہماری فرح نے تو ابھی سے طے کر لیا ہے کہ وہ زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہے۔''
''تم یہ تو نہیں جاننا چاہو گے کہ اُس نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' بیگم درّانی ہاتھ میں شال لئے آئیں اور اپنی بہن کی طرف بڑھادی۔ پھر خوشی سے مسکرا کر انہوں نے عامر سے کہا'' میرا خوبصورت بھانجا تو بزنس مین بننا چاہتا ہے۔''
''میں تو خوش ہو جاؤں اگر یہ بینکار بن سکے۔''
''چاہے کچھ بھی بنے۔ مجھے یقین ہے کامیاب رہے گا۔'' بیگم درّانی بولیں۔
''لڑکے ہر کام اچھا ہی کرتے ہیں۔''
کوئی گھنٹہ بھر وہ لوگ یونہی باتیں کرتے رہے۔ شام خوشگوار حد تک ُخنک تھی۔
نیچے گھنی وادی سے مینڈکوں کی ٹرٹر اور ٹڈیوں کی چک چک سنائی دے رہی تھی۔
ان سب نے مل کر یہ طے کیا کہ اگلے چار دنوں میں وہ اسلام آباد اور راولپنڈی میں اِدھر اُدھر گھوم لیں گے اور پھر جمعہ کو مری جائیں گے تا کہ ہفتہ، اتوار کی چھٹیاں

وہاں گزاریں۔
''آپا، آپ کو گلیات کا علاقہ پسند آئے گا۔'' درّانی صاحب نے اپنی سالی سے کہا۔
''کراچی کے بعد یہ تبدیلی آپ کو بہت اچھی لگے گی۔''

اللہ اللہ کر کے جمعہ آن پہنچا۔ درّانی صاحب جیسے ہی نماز پڑھ کر آئے سب نے گلیات جانے کی تیاری شروع کر دی۔
''ہم سات ہیں اور گاڑی میں ذرا پھنس پھنسا کر ہی بیٹھنا پڑے گا۔'' درّانی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اور عامر آگے بیٹھ جائیں گے، اور سارہ ہمارے بیچ میں اور تم چاروں خواتین، پچھلی سیٹ پر کسی طرح بیٹھ جانا۔''
''بابا، ہم کہاں ٹھہریں گے؟'' سارہ نے اپنے والد سے پوچھا۔
''سارہ، میرا خیال تھا کہ اگر ہم ڈونگا گلی میں ٹھہریں تو اچھا رہے گا۔ میں نے وہاں ہوٹل میں کمروں کا انتظام کر دیا ہے۔'' اُس کے بابا بولے۔ ''اور وہاں سے ہم چاہے، بھوربن، مری، نتھیا گلی یا ایوبیہ، کہیں بھی جا سکتے ہیں۔''
''میں سمجھا تھا ہم مری جا رہے ہیں۔'' عامر نے کہا۔ ''یہ سب جگہیں کیا ہیں؟''
''مری میں اس قدر ہجوم اور ہنگامہ ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کاروبار بھی بہت بڑھ گیا ہے۔'' درّانی صاحب کہنے لگے۔ ''اب مری میں ٹھہرنے کا کوئی لطف نہیں۔ ڈونگا گلی جیسی جگہ میں ٹھہرنا کہیں اچھا ہے۔ یہ جگہ پرسکون بھی ہے اور خوبصورت بھی۔'' ''مری کچھ رونق والی جگہ لگتی ہے۔'' عامر نے اصرار کیا۔
''وہیں نہ ٹھہریں؟''
''بھائی!'' اس کی بہن نازش نے اسے ٹوکا۔ ''ہم خود ایک بڑے شہر سے آ رہے

ہیں ہمیں ایک اور بھیڑ بھاڑ کی جگہ نہیں جانا چاہئے۔ مجھے یقین ہے خالو جان بہتر سمجھتے ہیں۔'' ''ہم ڈونگا گلی سے مری بڑی آسانی سے جا سکتے ہیں۔'' بیگم درّانی نے بات سنبھالی۔

ان کی بہن، بیگم اسماعیل نے جیسے اُن کے دل کی بات بھانپ لی۔

''مَردوں کا وطیرہ یہی ہے۔ ان کی ہمیشہ اپنی ہی رائے ہوتی ہے۔''

وہ اس بات سے بے مزہ لگ رہی تھیں کہ اُن کا بیٹا خواہ مخواہ مسئلے کھڑے کر رہا ہے۔

''لڑکے، ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔'' بیگم درّانی ہنس کر کہنے لگیں۔ وہ بالکل نہیں چاہ رہی تھیں کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

''اور لڑکیاں، لڑکیاں ہی رہیں گی۔'' ان کی بہن نے جواب دیا۔ ''ایمان سے اسماء تم خود کو خوش نصیب سمجھو تمہیں بیٹے نہیں پالنا پڑے۔ بعض وقت یہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

گھر سے چل کر ڈھائی گھنٹے میں وہ سب ڈونگا گلی پہنچے۔

کار سے باہر اتر کر سب کو جیسے سکون مل گیا، وہ سُکڑ کر بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے۔

''کس قدر پیارا موسم ہے۔'' نازش چہک اُٹھی۔

''کاش کراچی میں بھی ایسا موسم ہوا کرتا۔''

''بہت اچھا ہے نہیں ہوتا۔'' فرح بولی۔ ''ورنہ تم ہم سے ملنے نہ آتیں۔''

ہوٹل کے ملازموں نے باہر آ کر ان کا اسباب گاڑی سے نکالا، اور انہیں ساتھ لے کر کمروں کی طرف چلے۔ ہوٹل ایک ذرا اُونچی پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے برف سے ڈھکی میران جانی کی چوٹی تھی، اور دوسری طرف گھنا جنگل۔



وہ سب ہوٹل کے لان میں کھڑے، صاف اور تازہ ہوا کا مزہ لے رہے تھے کہ فرح نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

''نازش ادھر دیکھو، وہ ایوبیہ نیشنل پارک ہے۔ میں تمہیں اسی کے بارے میں بتا رہی تھی۔''

''واہ، یہ تو واقعی مزے کی جگہ لگتی ہے۔'' نازش نے کہا۔ ''تم نے پارک کے اندر اِس راستہ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ جس پر چل کر ہم ایوبیہ جا سکتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''کہا تھا نا؟'' ''ہاں کہا تھا۔'' فرح نے جواب دیا۔ ''یہ راستہ پارک میں سے جاتا ہے اور بے حد خوبصورت ہے۔ اسے پائپ لائن واک کہتے ہیں۔''

''اسے پائپ لائن واک کیوں کہتے ہیں؟'' عامر نے پوچھا۔

''انگریزوں کے زمانے میں اس راستے کے نیچے ایوبیہ سے ڈونگا گلی تک پانی کی پائپ

لائن بچھائی گئی تھی۔'' درّانی صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''میرا خیال ہے یہ ابھی تک اسی لئے استعمال ہوتی ہے۔''
''یہاں سے ایوبیہ تک ایک گھنٹہ لگتا ہے۔'' فرح نے بتایا۔
''ہمیں ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ لیکن ان کراچی والوں کو دو گھنٹے سے کم نہیں لگیں گے۔ انہیں چلنے کی ایسی عادت نہیں ہے۔'' سارہ شوخی سے بولی۔
وہ اپنی سمجھ اور مشاہدہ کی تیزی جتارہی تھی۔
''شرط لگالو، میں تم جتنا تیز چل سکتی ہوں، سنا بند ریا۔''
نازش نے پیار سے سارہ کو چپت لگاتے ہوئے کہا۔
''پائپ لائن کی سیر اتوار کو رکھتے ہیں، واپسی سے پہلے یہ ٹھیک رہے گی۔''
درّانی صاحب نے اپنی رائے دی۔
''آج اور کل کیا کریں گے بابا؟'' سارہ نے پوچھا۔
''آج، تو بس آرام کریں گے'' بابا نے جواب دیا۔ ''اور کل صُبح، اگر ہم جلدی نکل سکیں تو مری چلے جائیں گے۔ دوپہر کا کھانا وہاں کھاکر بھوربن جا سکتے ہیں۔''

اگلا دن مری اور بھوربن میں بڑے لُطف سے گزرا۔ جب شام کو وہ سب ڈونگا گلی پلٹے، تو ہر کوئی بے حد تھکا ہوا تھا۔
''میں تو بہت تھک گئی، مجھے نہیں لگتا کہ کل میں لیٹنے کے سوا کچھ اور کر سکوں گی۔''
بیگم اسماعیل نے کراہتے ہوئے کہا۔
''آپ بستر سے مت اُٹھیئے گا خالہ۔'' فرح نے محبت سے کہا۔
''میں آپ کا ناشتہ وہیں لے آؤں گی۔''

''فرح، تم بہت پیاری ہو۔'' اس کی خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لڑکیاں بہت خیال کرتی ہیں۔''

''تب ہی تو کہتے ہیں کہ لڑکیاں نعمت ہیں۔'' درّانی صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

''میں واقعی خوش نصیب ہوں، میری دو بیٹیاں ہیں، بڑھاپے میں میری دیکھ بھال کرنے کو۔''

''میری دعا ہے، وہ اپنے اپنے گھروں کی دیکھ بھال کریں۔''اُن کی بیوی بولیں۔

''بابا، آپ کی خدمت کرنے کو میں ہمیشہ موجود ہوں۔''

سارہ نے باپ سے چمٹتے ہوئے کہا۔

''میری شہزادی، بہت بہت شکریہ!'' انہوں نے اُس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔

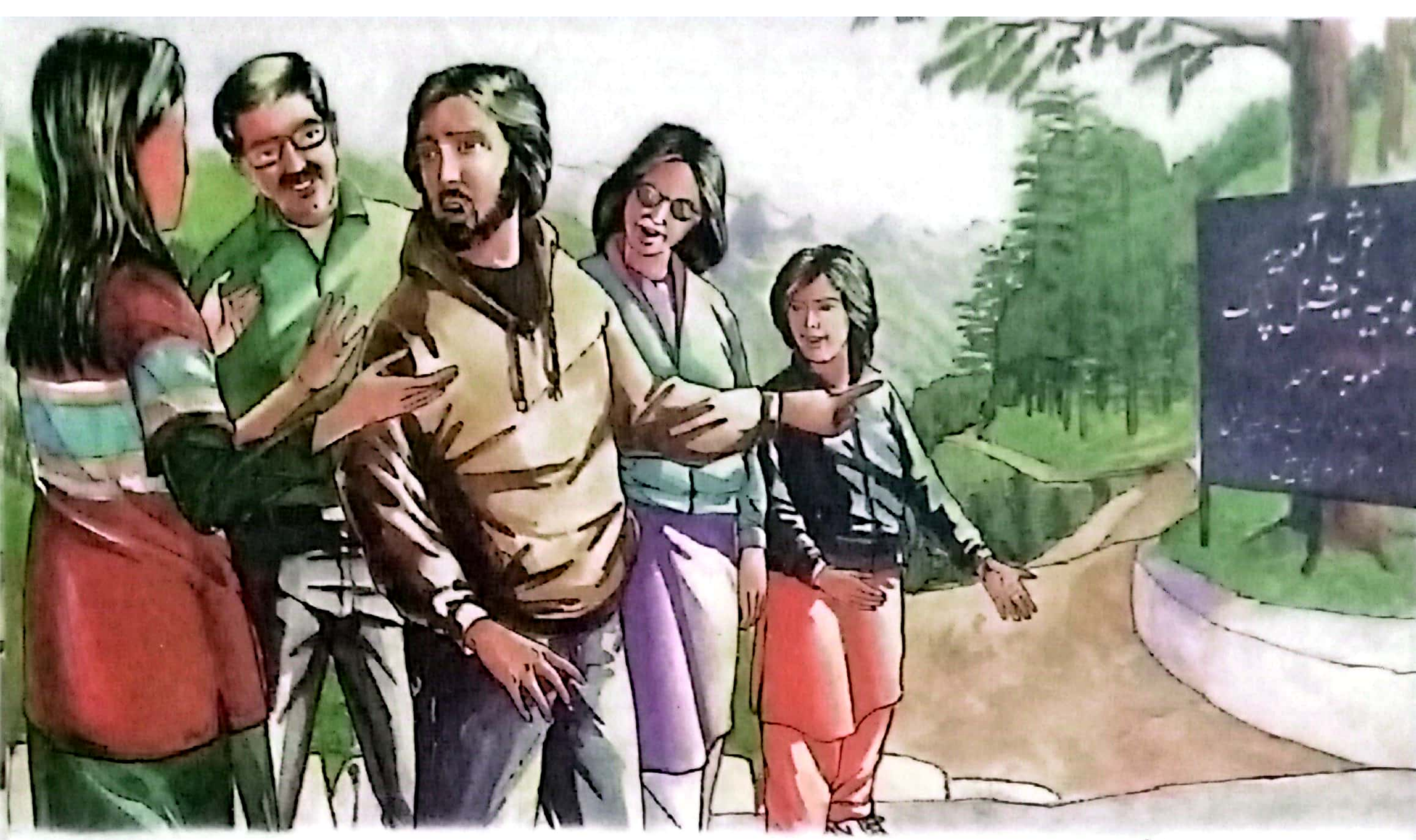
اگلی صُبح وہ اور بھی جلدی تیار ہو گئے۔ فرح کا تو اصرار تھا کہ بس چائے کی ایک پیالی پی کر، سات بجے تک نکل کھڑے ہوں تاکہ صُبح کی تازگی کا مزہ لیا جاسکے۔

پائپ لائن کا راستہ ایوبیہ پر ختم ہوتا تھا۔ تو فیصلہ یہ ہوا کہ ناشتہ ایوبیہ میں کیا جائے۔

سیر کی پارٹی میں درّانی صاحب، عامر اور تینوں لڑکیاں شامل تھیں۔

بیگم اسماعیل اور بیگم درّانی دونوں خواتین ان کے ساتھ چلنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوئیں۔ جب پیدل چلنے والے سیر کے لئے چلے جائیں گے تو آدھے گھنٹہ بعد وہ ٹیکسی سے ایوبیہ آجائیں گی۔ اتنی دیر میں یہ سب بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

چاروں سیلانیوں نے اپنی جیبیں خشک میوے سے بھر لیں اور پائپ لائن کی راہ لی۔



ایوبیہ نیشنل پارک کی سیر کو آنے والوں کو خوش آمدید کرتے ہوئے ایک سائن بورڈ نے ان کا استقبال کیا۔ یہاں یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ سیر کرنے والے، کوڑا کرکٹ نہ پھیلائیں اور شور نہ مچائیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک بورڈ پر ان پرندوں کی تصویریں اور نام لکھے تھے جو ایوبیہ نیشنل پارک میں رہتے ہیں۔

''خدا کرے یہاں خطرناک جنگلی جانور نہ ہوں۔'' عامر نے گھنے جنگل کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو کر کہا۔ ''یہاں واقعی ایسے جانور بھی ہیں۔''

فرح بولی۔ ''آخر یہ ایک نیشنل پارک ہے۔ ڈرو نہیں، ان سے کوئی خطرہ نہیں۔''

''اچھا، تمہیں اس بات کا یقین کیسے ہے؟'' عامر نے پوچھا۔ ''جانور کون کون سے ہیں؟''

''بندر، لومڑیاں، قیمتی سمور والے نیولے، خارپشت اور چیتے بھی۔'' فرح نے جواب دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اب عامر واقعی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر چیتے کا نام سُن کر۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''مگر جیسا میں نے کہا، فکر کی کوئی بات نہیں۔

کیونکہ زیادہ تر یہ جانور شب باش ہیں۔ ہاں بندر ضرور ایسے نہیں ہیں۔''

''شب باش کیا ہوتا ہے؟'' نازش نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کاٹتے واٹتے نہیں ہیں؟''

''شب باش کا مطلب ہے کہ یہ رات کو گھومتے پھرتے ہیں۔'' سارہ نے کہا۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ اُسے بھی جنگلی جانوروں کے متعلق معلوم تھا۔ ''دن میں وہ کہیں چُھپ کر آرام کرتے ہیں۔''

''میں نہیں مانتا کہ یہاں چیتے ہیں۔'' عامر نے کہا۔ ''تم ہمیں ڈرا رہی ہو۔''

''نہیں، یہ مذاق نہیں کر رہی ہے۔'' درّانی صاحب نے فرح کی بات کی تصدیق کی۔ ''ان گلیوں میں واقعی چیتے موجود ہیں۔''

عامر چلتے چلتے رُک گیا۔ دوسرے بھی ٹھہر گئے۔

''چلیئے، واپس چلیں۔'' عامر بولا۔ ''میرا مطلب ہے تین لڑکیوں کا ساتھ ہے، خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں۔''

فرح ہنس پڑی۔ ''جانے بھی دیجئے عامر بھائی۔'' اس نے کہا۔ ''ہم درجنوں مرتبہ یہاں سیر کرنے آچکے ہیں اور ہم نے کبھی یہاں چیتا نہیں دیکھا۔'' پھر شرارت سے اُس نے بات بڑھائی۔ ''کاش ہم نے دیکھا ہوتا۔ کتنا مزہ آئے جو جنگل میں چیتا نظر آجائے۔ چڑیا گھر میں پنجروں میں بند دیکھنے کا کیا مزہ۔''

ایک ہاتھ میں نازش کا ہاتھ، اور دوسرے سے سارہ کا ہاتھ پکڑے اس نے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ ہچکچاہٹ سے عامر نے بھی تینوں لڑکیوں کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ درّانی صاحب اُس کے ساتھ چل رہے تھے۔

''دراصل تو یہ بندر ہیں جن سے ڈرنا چاہئے۔'' فرح نے مُڑ کر کہا۔
''وہ ہم انسانوں سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب بالکل نہیں جھجکتے۔ خاص طور پر اگر آپ کے پاس کھانے پینے کا سامان ہو۔ تب تو وہ جھپٹا بھی مار سکتے ہیں۔''
''بہت عمدہ!'' عامر نے کہا۔ اس کی آواز میں جُھنجلاہٹ تھی۔ اس نے جُھک کر پگڈنڈی سے لکڑی کی ایک ٹہنی اٹھالی۔ ''شاید ضرورت پڑ جائے۔'' اس نے درّانی صاحب سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک چُپ چاپ چلتے رہے۔ ایک پہاڑی کو کاٹ کر سیر کے لئے یہ پگڈنڈی بنائی گئی تھی۔
ایک طرف سیدھی چڑھائی تھی اور دوسری طرف گہری ڈھلوان جو نیچے وادی تک چلی گئی تھی۔ اس کی تہہ تک نظر نہ جاسکتی تھی۔ جنگل بہت گھنا تھا۔
جنگلی کھمبیاں اور بیلیں راستے کے دونوں طرف خودرو تھیں۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں سے چشموں کا پانی بوند بوند بہہ کر پگڈنڈی کو پار کرتا ہوا ڈھلوان سے ہو کر نیچے کہیں وادی میں رِس رہا تھا۔

صُبح کی تازہ ہوا چیڑ کی خوشبو سے مَہک رہی تھی۔ قد آور درختوں کے نیچے ہری گھاس پر کہیں کہیں جنگلی بنفشہ کِھلا ہوا تھا۔ چیڑ کے پھول اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی بھی دھند اتنی تھی کہ سو گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

جنگل میں چپ چاپ چلتے ہوئے، کنکریوں پر ان کے قدموں کی چاپ اور ان دیکھی چڑیوں کی چہچہاہٹ کے سوا دوسری کوئی آواز نہ تھی۔



''اُدھر دیکھو۔'' درّانی صاحب نے پگڈنڈی سے کچھ اُوپر آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سامنے ایک شفاف چشمہ تھا۔ ہوا میں اس کا فوارہ سا اُچھلتا اور پانی ڈھلوان کے پتھروں پر نیچے گرتا تو ایسے لگتا جیسے کہیں چھناکا ہوا ہو۔
پگڈنڈی کے پاس ایک اچھا خاصا چوڑا تالاب سا بن گیا تھا۔ پانی ایسا شفاف تھا کہ نظر تہہ تک چلی جاتی تھی۔ تالاب سے پانی ایک ندی کی شکل میں آگے کو بہہ رہا تھا اور یہاں راستہ پر ایک پُل بنا دیا تھا۔

وہ پُل پر کھڑے ہو کر آبشار کو دیکھتے رہے۔ لگتا ہے کہیں پچاس گز اوپر ہی سے وہ چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ لیکن اس کا سوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''چلو، اُوپر چل کر دیکھیں، پانی کہاں سے آرہا ہے؟'' عامر نے تجویز پیش کی۔
''کہنا سہل ہے میاں۔'' درّانی صاحب بولے۔ ''ابھی تو یہ معمولی بات لگ رہی ہے، مگر یہ چڑھائی ڈھلوان پر ہے، اور لمبی بھی ہے۔ اتنی بات میں سمجھتا ہوں۔''
''کیا بات ہے!'' عامر شرارت سے مسکرایا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کراچی والوں سے یہ مشقت نہیں اٹھائی جاتی۔''

''چیلنج کر رہے ہیں آپ؟'' فرح نے پوچھا۔ ''ایسا ہی سمجھ لو'' عامر نے جواب دیا۔
''یہ بات ہے تو بسم اللہ۔'' فرح نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔
''دوسرے کیوں پیچھے رہتے وہ بھی چلے لیکن چڑھائی مشکل تھی۔ راستہ میں پھسلن تھی۔ رات کی اوس سے بھیگی زمین، چیڑ کے نوکیلے پتے اور خودرو جڑی بوٹیوں نے چڑھنا اور بھی دشوار کر دیا تھا۔
کہیں کہیں تو چڑھائی بالکل سیدھی لکیر کی طرح تھی۔ درّانی صاحب سب سے آخر میں آرہے تھے۔ ایک ہاتھ سے سارہ کو تھامے، چڑھنے میں اس کی مدد کر رہے تھے کہ وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ منٹوں ہی میں وہ سب ہانپنے لگے، لیکن تھکنے میں پہل کرنے کی شرمندگی سے بچنے کو سب چلے جارہے تھے۔
جیسے جیسے وہ چڑھائی چڑھ رہے تھے چشمہ کا سوتا اتنا ہی دور ہوتا جارہا تھا۔
کچھ دیر بعد تو درختوں اور جھاڑیوں میں راستہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ جس سے چڑھ کر وہ اُوپر جارہے تھے۔
آخرکار ڈھلوان ایک جگہ ذرا چوڑی ہو گئی۔ اس سے آگے جنگل گھنا اور اندھیرا تھا۔ پراسرار بھی لگ رہا تھا۔

''اُف!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میرا نہیں خیال تھا، راستہ اتنا مشکل ہو گا۔''
''تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا۔'' درّانی صاحب ہنس کر بولے اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔

تینوں لڑکیاں بھی دھم سے بیٹھ گئیں اور سب نے سوچا ذرا استا لیا جائے۔

''فرض کیجئے ہم کہیں گم ہو جائیں یا ہمیں راستہ ہی نہ ملے۔'' سارہ نے کہا۔

''ایسی باتیں مت کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' نازش نے مذاق میں خوفزدہ ہو کر کہا۔

'' سوچیے تو سہی، اگر ہم گمُ ہو جائیں تو!'' سارہ اپنی بات پر اَڑی رہی۔

''تو پھر، میری پیاری بہن۔'' فرح نے پیار سے سارہ کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

''پھر جو کچھ یہاں میسر ہے اسی پر گزارا کرنا پڑے گا، کیوں؟''

نظر اوپر گئی تو دیکھا کہ بہت سے پہاڑی کوّے کائیں کائیں کرتے چکر لگا رہے تھے۔

ان میں سے ایک ندی کے کنارے گھاس پر ٹکا، اور الٹے ہاتھ کی طرف چلنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ معاملہ بھانپ سکتے، خدا جانے کہاں سے کئی اور پہاڑی کوّے نکل آئے۔ کچھ تو ان کے سروں پر چکر لگاتے رہے۔ کچھ ٹہنیوں پر ٹک گئے۔

کچھ پہلے کوّوں کے پاس پہنچے اور اُلٹے ہاتھ کو درختوں کی طرف بڑھنے لگے۔

''کیا مل گیا ہے انہیں؟'' فرح نے کہا۔ ''شاید کچھ کھانے کو۔''

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' عامر بولا۔

وہ اُٹھ کر پیڑوں کی طرف چلا۔ پہاڑی کوّوں نے احتجاجاً زور زور سے چلاّنا شروع کر دیا۔ گھنے جُھنڈ میں وہ داخل ہی ہوا تھا کہ اس نے زور کی چیخ ماری۔

''کیا ہوا؟'' درّانی صاحب گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور عامر کی طرف دوڑے۔

تینوں لڑکیاں بھی اُٹھیں اور آگے بڑھنے لگیں۔

درّانی صاحب نے وہیں سے کہا۔ ''یہاں پاس مت آؤ۔ ایک مردہ جانور پڑا ہے۔ یہاں؟ کوئی اچھی چیز نہیں ہے دیکھنے کو۔''

سارہ اور نازش تو رک گئیں مگر فرح آگے چلتی گئی۔

''کون سا جانور ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں بھی تو دیکھوں، آخر میں جانوروں کی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔''

وہ مُردوں کے قریب جا پہنچی۔ گھاس پر چند گز دور کسی جانور کی کھائی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا کہ جانور کون سا تھا؟ لیکن لاش کے وہاں ہونے کا مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

''نہیں!'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''ہم کسی درندے کے شکار تک آ پہنچے ہیں۔''

درّانی صاحب سمجھ گئے کہ بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ جانوروں کے متعلق بہت کچھ پڑھتی رہتی تھی۔ ان کو جُھرجُھری آ گئی۔ ''حماقت تھی میری'' انہوں نے سوچا۔ ''جو اِن بچّوں کو اچھے بھلے رستہ سے ہٹا کر یہاں چڑھنے دیا۔''

''نکلو یہاں سے۔'' انہوں نے کہا۔ بے دھیانی سے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سب پہاڑی کوّے زمین سے اُڑ کر ٹہنیوں جا بیٹھے تھے۔

وہ سب واپس جانے کو مڑے مگر جیسے سب پتھر کے ہو گئے۔ سامنے کُھلی جگہ پر ایک چیتا اُن پر آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔ سارہ اور نازش جو دوسروں سے ذرا پیچھے تھیں، چیتے سے بہ مشکل تیس قدم دور ہوں گی۔

''میرے اللہ!'' نازش نے زیرِ لب کہا اور اسے تھرتھری چھوٹ گئی۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔'' سارہ چیتے کو دیکھ کر چیخی۔

ڈر کے مارے اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔



''چپ رہو سارہ۔'' فرح نے پیچھے سے اسے آواز دی۔

''اور دیکھو اچانک حرکت بھی نہ کرنا۔'' آنکھ کے کونے سے اس نے دیکھا کہ عامر پتھر اُٹھانے کو نیچے جھکا ہے۔

''عامر نہیں۔'' اس نے عامر کو ڈانٹا۔ ''ہم نے جانور کو پریشان کر دیا ہے۔ ہم اُس کے اور شکار کے بیچ میں آ گئے ہیں۔ بہترین صورت یہ ہو گی کہ ہم بائیں طرف کو مڑ جائیں، تاکہ اس سے اور اس کے کھانے سے دور ہو جائیں۔''

اتنے میں چیتا چنگھاڑا۔ اس کے جبڑے کُھل کر پھیل گئے تھے اور خونخوار نوکیلے دانت نظر آنے لگے اور کان مارے غُصّے کے اس کی کھوپڑی سے جا لگے تھے۔ وہ نیچے کو جُھکا اور دو چار قدم آگے بڑھائے۔ جیسے وہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہا ہو۔ نازش اور سارہ اس کے قریب تر تھیں۔

''بابا!'' سارہ چِلّائی اور مُڑ کر اپنے ابا کی طرف بھاگی۔
''سارہ!'' دُرّانی صاحب نے بھی چِلّا کر اسے پُکارا اور اس کی طرف دوڑے۔
اچانک اُن کا پاؤں ایک جھاڑی میں اٹک گیا اور وہ اوندھے مُنہ گر پڑے۔
''چُپ رہو سارہ۔'' فرح نے پیچھے سے اُسے آواز دی۔

چیتا جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی اَنگارہ سی آنکھیں اُن پر جمی تھیں اور وہ غرّائے جا رہا تھا۔
اتنے میں سارہ اور نازش دُرّانی صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔ یہ دیکھ کر ان کا دم نکل گیا کہ دُرّانی صاحب کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ بے حس و حرکت پڑے تھے۔
''ہائے میرے اللہ!'' سارہ نے کہا۔ آنسو اس کے گالوں پر بے اختیار بہہ رہے تھے۔ ''بابا کو کچھ ہو گیا ہے۔''
ایک وقت میں ایک ایک قدم اٹھاتی، فرح دھیرے دھیرے اپنے ابا کی طرف بڑھی۔
وہ بڑی خاموشی سے جُھکی، اُس کی نظریں چیتے پر لگی ہوئی تھیں۔
اس کے بابا کی کنپٹی پر ایک بڑا سا گومڑا پڑ گیا تھا۔ شُکر ہے کہیں زخم نہیں آیا تھا۔
چوٹ کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ جو پاؤں جھاڑی میں اُلجھ گیا تھا اس میں بھی موچ آ گئی تھی اور اس پر سوجن بڑھ رہی تھی۔
''بھائی، کچھ کرو۔'' نازش نے بے بسی سے اپنے بھائی سے کہا۔
لڑکیوں نے پیچھے مڑ کر عامر کو دیکھا۔ وہ چند گز پیچھے دم بخود کھڑا تھا۔
اس کی آنکھیں چیتے پر جمی ہوئی تھیں اور ڈر کے مارے کپکپا رہا تھا۔
لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو اور نازش کی بات تک نہ سُن رہا ہو۔



فرح کو اندازہ ہو گیا کہ اب اسے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اُس کے ابا زخمی ہو گئے تھے اور عامر کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کس آفت میں تھے۔ اتنے میں چیتا بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور غضب کے مارے غُرا غُرا کر ان کے گرد گھومنے لگا۔

فرح نے عامر کی طرف دیکھا اور سختی سے بولی۔
''عامر بھائی، میری بات غور سے سنیئے، بابا کے پیر میں موچ آگئی ہے اور وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اب وہ کچھ کچھ ہوش میں آرہے ہیں، لیکن اُنہیں کھڑے ہونے اور چلنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو گی۔

''بابا!'' سارہ چلّائی اور مُڑ کر اپنے ابا کی طرف بھاگی۔
''سارہ!'' درّانی صاحب نے بھی چلّا کر اسے پکارا اور اس کی طرف دوڑے۔
اچانک اُن کا پاؤں ایک جھاڑی میں اٹک گیا اور وہ اوندھے مُنہ گر پڑے۔
''چُپ رہو سارہ۔'' فرح نے پیچھے سے اُسے آواز دی۔

چیتا جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی اَنگارہ سی آنکھیں اُن پر جمی تھیں اور وہ غرّائے جارہا تھا۔
اتنے میں سارہ اور نازش درّانی صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔ یہ دیکھ کر ان کا دم نکل گیا کہ درّانی صاحب کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ بے حس و حرکت پڑے تھے۔
''ہائے میرے اللہ!'' سارہ نے کہا۔ آنسو اس کے گالوں پر بے اختیار بہہ رہے تھے۔ ''بابا کو کچھ ہو گیا ہے۔''
ایک وقت میں ایک ایک قدم اٹھاتی، فرح دھیرے دھیرے اپنے ابا کی طرف بڑھی۔ وہ بڑی خاموشی سے جُھکی، اُس کی نظریں چیتے پر لگی ہوئی تھیں۔
اس کے بابا کی کنپٹی پر ایک بڑا سا گومڑا پڑ گیا تھا۔ شُکر ہے کہیں زخم نہیں آیا تھا۔
چوٹ کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ جو پاؤں جھاڑی میں اُلجھ گیا تھا اس میں بھی موچ آگئی تھی اور اس پر سوجن بڑھ رہی تھی۔
''بھائی، کچھ کرو۔'' نازش نے بے بسی سے اپنے بھائی سے کہا۔
لڑکیوں نے پیچھے مڑ کر عامر کو دیکھا۔ وہ چند گز پیچھے دم بخود کھڑا تھا۔
اس کی آنکھیں چیتے پر جمی ہوئی تھیں اور ڈر کے مارے کپکپا رہا تھا۔
لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو اور نازش کی بات تک نہ سُن رہا ہو۔



فرح کو اندازہ ہو گیا کہ اب اسے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اُس کے ابا زخمی ہو گئے تھے اور عامر کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کس آفت میں تھے۔ اتنے میں چیتا بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور غضب کے مارے غُراغُرا کر ان کے گرد گھومنے لگا۔

فرح نے عامر کی طرف دیکھا اور سختی سے بولی۔
"عامر بھائی، میری بات غور سے سنیئے، بابا کے پیر میں موچ آگئی ہے اور وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اب وہ کُچھ کُچھ ہوش میں آرہے ہیں، لیکن اُنہیں کھڑے ہونے اور چلنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو گی۔

آپ میری بات سُن رہے ہیں؟''

عامر نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ تو بس چیتے کو گھورے جا رہا تھا۔

''اور تم سب بھی سُنو'' فرح نے کہا'' چیتا کچھ اُلجھا ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم بھاگے کیوں نہیں؟ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ ہم پر حملہ کر دے۔ میں جانتی ہوں، ہم سب کو ڈر لگ رہا ہے، مگر ہمیں اپنے حواس ٹھکانے رکھنا ہونگے۔ میری بات سمجھ رہے ہو تم لوگ؟''

سب نے سر ہلا دیا۔ ڈر کے مارے کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

''تو ایسا ہی کرنا ہے ہم سب کو۔'' فرح بولے گئی۔'' میں دوسری سمت میں چل کر چیتے کی طرف جاتی ہوں، تاکہ اس کی توجہ اِدھر سے ہٹے۔''

''نہیں آپی۔'' سارہ نے بے چین ہو کر بہن کو ٹوکا۔

''چُپ رہو اور سُنو۔'' فرح نے بہن کو سمجھایا۔ ''بس یہی ایک طریقہ ہے۔ جیسے ہی میں چلنا شروع کروں، تم سب اُٹھنے میں بابا کی مدد کرنا اور جس طرف سے ہم آئے تھے اُدھر کو چلنا شروع کر دینا۔ بے حد آہستہ چلنا اور جانور کی طرف پیٹھ نہ موڑنا۔ اس بات کا یقین کر لینا کہ وہ تمہیں پیچھے ہٹتا دیکھ لے۔''

''اور تم کیا کرو گی؟ فرح''اس کی خالہ زاد بہن نازش نے پوچھا۔

''میری فکر مت کرو، میں خیریت سے رہوں گی۔'' فرح نے کہا لیکن اس کے گلے میں جیسے کچھ اٹک سا گیا۔ ڈر تو اُسے بھی بہت لگ رہا تھا۔ ڈر کے باوجود اسے یہ احساس تھا کہ وہ چیتے کو حملہ کرنے سے روک سکتی ہے۔ اُس نے اُن چیزوں کے بارے میں کتابیں پڑھیں تھیں اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ اب اِس سب پر عمل کرنے کا وقت تھا۔ مگر اس پر خوف اور گھبراہٹ طاری تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہہ سکتا، وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ایک دائرے میں چلتی ہوئی، چیتے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اب بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ جیسے یہ جاننا چاہتا ہو، کہ یہ لوگ اب کیا کریں گے؟ اس نے اپنا سر فرح کی طرف گھمایا اور دیر تک غُرّاتا رہا۔ اس دوران میں درّانی صاحب کو ہوش آگیا تھا۔

اپنی چوٹوں کی تکلیف سے کراہتے ہوئے وہ اُٹھ کر بیٹھے۔ عامران کے پاس گیا اور اُن کے کان میں فرح کی تجویز دہرائی۔

''نہیں فرح۔'' انہوں نے بیٹی کو پکارا۔ ''اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میں اس وحشی کو دھمکا کر بھگادوں گا۔''

فرح نے چیتے پر سے اپنی نظریں نہ ہٹائیں۔

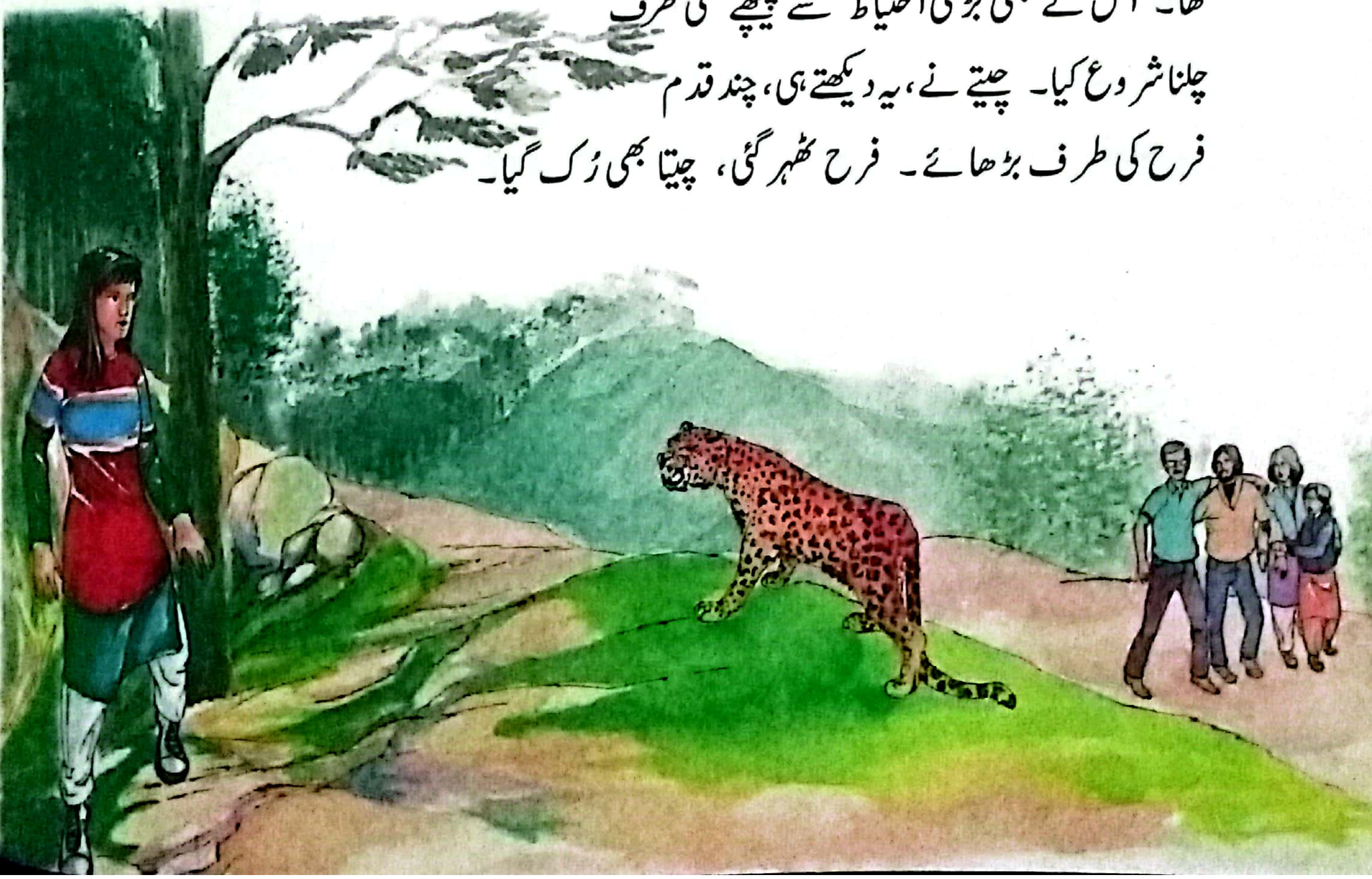
''بابا، بڑی خوش نصیبی ہوگی اگر آپ اپنے آپ کھڑے بھی ہوسکیں۔'' اس نے اپنے والد کو جواب دیا۔

''مہربانی کر کے ویسا ہی کیجئے جیسا میں نے کہا ہے۔ وگرنہ ہم سب خطرے میں ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں کیا کر رہی ہوں۔''

فرح نے اتنا جان لیا تھا کہ چیتا بھی ان کی طرح مُضطرب ہے۔ وہ بھی صرف اتنا چاہتا تھا کہ یہ سب کہیں چلے جائیں اور اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کا ارادہ چیتے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی لئے وہ غُرّا غُرّا کر اور چیخ چیخ کر انہیں ڈرا کر بھگا دینا چاہتا تھا۔ فرح کو خیال تھا کہ اس بات کا امکان نہیں کہ چیتا چار لوگوں پر حملہ کرے۔ وہ صرف اس وقت ہی حملہ کر سکتا تھا اگر اسے یہ خیال ہو جاتا کہ یہ سب لوگ اس کی جان کے لئے خطرہ تھے یا اُس پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔

اتنی بات کو سمجھ کر وہ اپنے ساتھیوں سے دور ہٹتی گئی، اور سارا وقت چیتے کے گرد گھومتی رہی۔ عامر نازش اور سارہ نے درّانی صاحب کو کھڑا ہونے میں مدد دی۔ عامر نے ایک طرف سے درّانی صاحب کو سہارا دیا تاکہ سُوجے ہوئے پیر پر ان کا بوجھ نہ پڑے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے پیچھے سرکنا شروع کیا تاکہ وہ چیتے اور اس کے شکار کے پاس نہ رہیں۔ چیتے نے تیزی سے اُن پر نظر دوڑائی اور انہیں پیچھے ہٹتا دیکھ کر اپنی نظریں فرح پر جمادیں۔

اتنی دیر میں فرح نے بڑی سمجھ داری سے چیتے کے گرد چکر لگائے اور اس طرح کہ وہ اس کے ادھ کھائے شکار کے سامنے سے ہٹ جائے۔ اُس نے آنکھوں کے کونوں سے یہ دیکھ لیا کہ باقی لوگ کافی حد تک پیچھے جا چکے تھے اور انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس نے بھی بڑی احتیاط سے پیچھے کی طرف چلنا شروع کیا۔ چیتے نے، یہ دیکھتے ہی، چند قدم فرح کی طرف بڑھائے۔ فرح ٹھہر گئی، چیتا بھی رُک گیا۔



دونوں نے ایک دوسرے پر نظریں ٹکادیں۔ ایسا لگتا تھا زمانے گزر گئے، فرح ہمت کر کے پھر دو چار قدم پیچھے ہٹی۔ اس مرتبہ چیتا اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

گن گن کر قدم رکھتی ہوئی فرح نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ سارا وقت اس کی نظریں چیتے پر جمی ہوئی تھیں۔

فرح نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ جیسے ہی خوف اور بے چینی کا کھنچاؤ کم ہوا، تو اسے احساس ہوا کہ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پسینے سے گیلے اور لجلجے ہو رہے تھے۔ وہ دھم سے گھاس پر بیٹھ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اچانک اسے بے حد تھکن کا احساس ہوا۔

وہ اس بات سے خوش بھی تھی کہ یہ سارا واقعہ بغیر کسی حادثے کے گزر گیا تھا۔ وحشی جانوروں کی سمجھ دار رویوں پر اس کا یقین اور بڑھ گیا۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جانور بالکل ہی وحشی ہوتے ہیں اور بلا وجہ انسانوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس چیتے نے انہیں صرف دھمکایا ہی تھا وہ بھی اس لئے کہ وہ اس کے شکار کے راستے میں حائل ہو گئے تھے۔ دیکھا جائے تو چیتے نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا اور انہیں اس بات کی پوری مہلت دی تھی کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔

فرح نے یہ بات بار بار پڑھی تھی کہ وحشی جانور صرف اُس وقت حملہ کرتے ہیں، جب انہیں ستایا جائے یا ان پر حملہ کیا جائے۔ آج یہ بات ثابت ہو گئی۔

اس کے کندھے پر کسی نے اچانک ہاتھ رکھا۔ یہ اس کے بابا تھے۔

عامر ابھی بھی انہیں سہارا دیئے ہوئے تھا۔

''تم پر مجھے ناز ہے میری بچی، آج تو تم نے کمال کر دیا۔'' اُس کے ابا نے کہا۔

''میری آپی۔'' سارہ اُس سے لپٹ گئی۔

عامر جھینپا سے کھڑا تھا۔ وہ تو اس سارے معاملے میں جیسے سکتے میں تھا۔

وہ کچھ بھی نہ کر پایا، ایک مرد کی حیثیت سے ایسے موقع پر اس سے بہت

امیدیں تھیں۔ ''فرح، میں شرمندہ ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہئے تھا۔''

''کسی نہ کسی کو تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ تھے یا میں۔''

فرح نے جواب دیا۔ ''شکر کی بات تو یہی ہے کہ ہم سب خیریت سے ہیں۔''

''مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہم سب کی بوٹیاں نوچ ڈالے گا۔'' عامر نے کہا۔

''پر نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟''

''خیر میں تو زیادہ تر سوتا ہی رہا۔'' درّانی صاحب کِھل کھلا کر ہنس پڑے۔

عامر کی شرمندگی کو مٹانے کی خاطر انہوں نے بات بنائی۔

''وگرنہ ہو سکتا ہے مارے ڈر کے میں کوئی حماقت کر ڈالتا۔''

''چلیئے ہٹایئے اس سب کو، ہم سب کو اب یہاں سے نکل جانا چاہیے، اس سے پہلے کہ

چیتا واپسی کا ارادہ کر ڈالے۔'' نازش نے منت بھری آواز میں کہا۔

درّانی صاحب نے بھی اتفاق کیا۔ ''ہاں بھئی چلو، تمہاری مائیں مارے پریشانی کے

اب تک بدحواس ہو چکی ہوں گی۔ ہمیں تو سیر ویر ختم کر کے کب کا

ایوبیہ پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

اُن سب نے پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کیا، لیکن ہر گھڑی پیچھے پلٹ کر دیکھتے رہے۔

درّانی صاحب کو بے حد تکلیف تھی اور انہیں واپس پگڈنڈی تک پہنچنا بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ بڑی بُری موچ ان کے پیر میں آئی تھی اور اس پر ان کا وزن نہیں پڑ رہا تھا۔

''میرا چلنا بے کار ہے۔'' بچّوں تم لوگ جاؤ، اور کوئی مدد ملے تو لے کر آؤ۔ میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں'' فرح نے کہا۔ آپ کو یہاں ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔ ''یہ بات ہے تو میں جاتا ہوں اور کسی کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔'' عامر نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

''میرے پاس ایک بہتر تجویز ہے عامر بھائی۔ ''فرح نے کہا۔ آپ یہاں ٹھہریں آپ کو ان پہاڑی راستوں کا کوئی علم نہیں اور میں کسی کو مدد کے لئے لے کر آتی ہوں۔ پھر یہ کہ آپ بابا کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ نیچے اتر سکتے ہیں۔ میں ذرا تیز چل کر کسی کو مدد کے لئے ڈھونڈتی ہوں۔ نازش میرے ساتھ آنا چاہے تو آسکتی ہے۔''

''تو یہی طے ہو گیا۔'' یہ کہہ کر فرح نے انہیں ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور نازش کے ساتھ پیڑوں کے جُھنڈ سے ہو کر نیچے کو چلی گئی۔

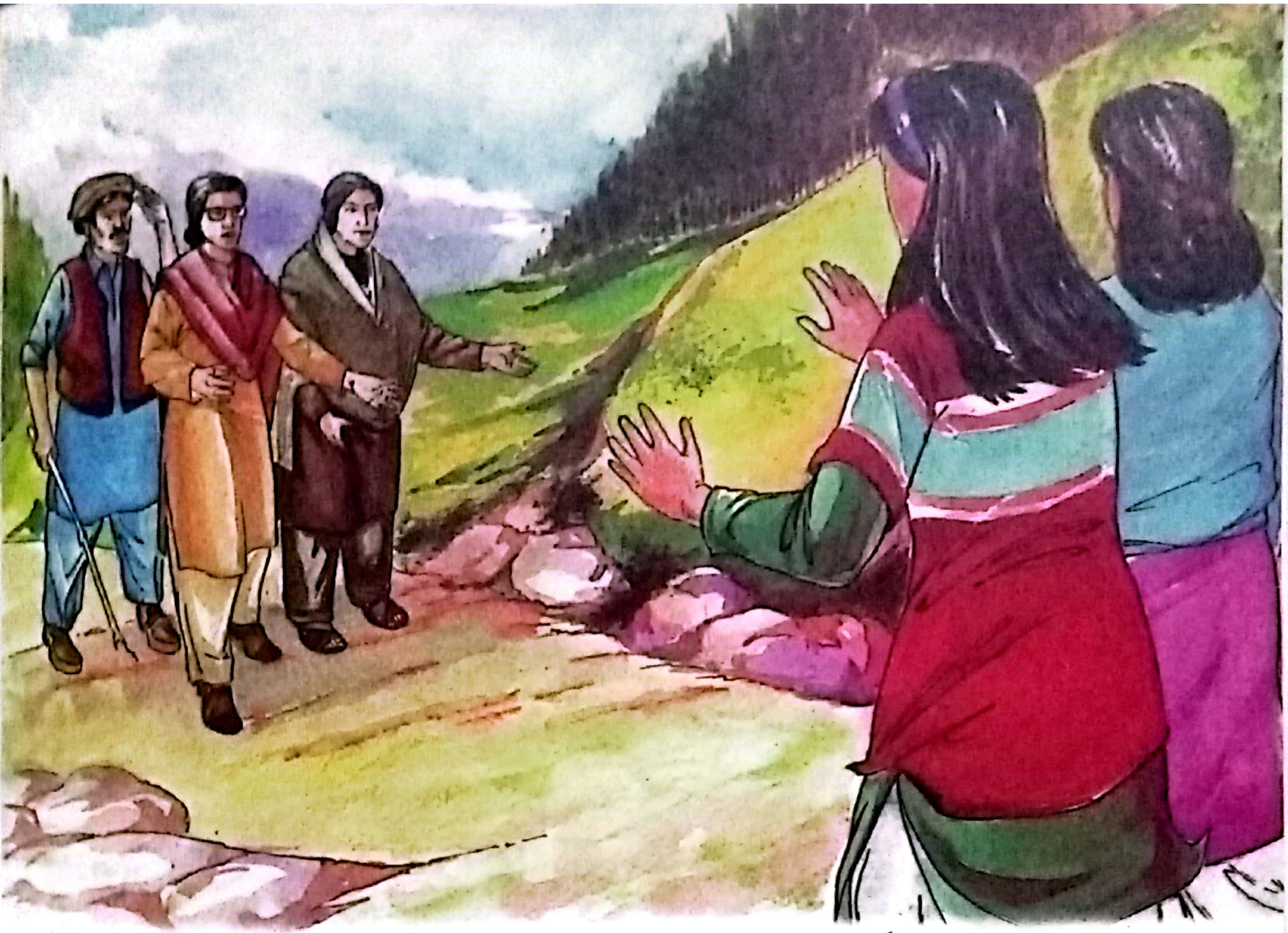
''کیا لڑکی ہے!'' نازش نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو بیٹا ہے میرا!'' درّانی صاحب نے کہا۔ اس وقت مارے غرور کے ان کا سر تُن گیا تھا۔ اُن کی بیٹی نے کیسی سمجھ داری اور کس حوصلہ سے یہ سارا وقت گزارا تھا۔

ذرا دیر میں نازش اور فرح پائپ لائن کے راستہ پر پہنچ گئیں۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا جس سے وہ مدد مانگ سکتیں۔

انہوں نے ایوبیہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔



ابھی دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ انہوں نے دیکھا کہ
دوسری طرف سے ایک چھوٹی سی پارٹی آرہی تھی۔ جیسے ہی وہ قریب آئے
فرح نے دیکھا کہ وہ تو اس کی اماں اور خالہ تھیں اور ان کے ساتھ شاید
ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ جب فرح کی اماں نے انہیں اپنی طرف بھاگ کر آتے دیکھا
تو وہ چلا اُٹھیں۔

''فرح!'' انہوں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''کہاں رہ گئے تم لوگ؟ کیا ہوا؟
باقی سب کہاں ہیں؟ ''سب خیریت ہے اماں، فکر کی کوئی بات نہیں'' اس نے کہا۔
''بابا گر پڑے اور ان کے پیر میں موچ آگئی۔
وہ ذرا پیچھے ہیں۔ ہم مدد کی تلاش میں تیزی سے ذرا آگے آگئے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ سب خیریت ہے۔'' ان کی اماں مطمئن ہو کر روہانسی سی ہو گئیں۔ ''ہم لوگ تو مارے فکر کے بدحواس ہو گئے تھے۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا تم سب کا انتظار کرتے۔''

''تو بیٹی، تمہارے ابا چل نہیں سکتے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

''جی'' فرح نے کہا۔ ''ان کا پیر سوج بھی بہت گیا ہے۔''

''میں جا کر ایک گھوڑا لے کر آتا ہوں، وہ اس پر بیٹھ کر آسکیں گے۔'' اس آدمی نے کہا۔ فرح کو بہت زیادہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس کی اماں نے بوتل میں سے ایک گلاس پانی انڈیل کر اُسے دیا۔

''ہمارا تو دم ہی نکل گیا تھا۔'' بیگم اسماعیل نے کہا۔ ''ایوبیہ میں ہمیں لوگوں نے بتایا کہ آج کل یہاں پہاڑ کی کسی کھوہ میں ایک چیتا آ کر رہ رہا ہے اور کبھی کبھی اُتر کر اس راستے پر بھی آجاتا ہے۔ ہم یہ سوچ کر گھبرا رہے تھے کہ شاید تم لوگوں کو وہ چیتا کہیں راستے میں نہ مل گیا ہو۔'' ''واقعی'' فرح خوش دلی سے بولی۔ ''اللہ بچائے، ہمیں تو کوئی بھی جانور راستے میں نہیں ملا۔'' اس نے راستہ کی حد تک تو سچ بولا۔

بعد میں جب وہ ڈونگا گلی کے ہوٹل میں، دوپہر کا کھانا کچھ دیر سے کھا رہے تھے تو صُبح والا قصہ بار بار دُہرایا جاتا رہا۔ اب سب کی طبعیت بہتر تھی، اور وہ صُبح کے واقعات پر ہنسی مذاق کر سکتے تھے۔ مگر بیگم درّانی اور بیگم اسماعیل کا ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔

''میں تو دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں، خدا نے تم لوگوں کو محفوظ رکھا۔'' بیگم اسماعیل نے اعلان کیا اور وضو کرنے کو اُٹھ کھڑی ہوئیں۔



مسز درّانی فرح کو دیکھ رہی تھیں اور اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
زندگی میں پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ ان کی بیٹی کس قدر بہادر اور ذہین لڑکی تھی۔ پہلی بار انہیں اپنے یہاں بیٹے کے نہ ہونے کا غم نہ تھا۔
اُن کی بیٹی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی بیٹے سے کم نہ تھی۔

''یہاں آؤ۔'' انہوں نے بیٹی کو محبت سے رُندھی ہوئی آواز میں بلایا۔
بیٹی کو بھینچ کر گلے لگایا اور اس کے کان میں دھیرے سے کہا۔
''میری جان، جس دن تو ہمیں چھوڑ کر کسی اور کا گھر بسانے چلی جائے گی تو ہم کیا کریں گے؟''

ملکیت حکومتِ پنجاب

فرح

فرح ایک بہادر لڑکی کی کہانی ہے جو وقت پڑنے پر کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار فرح معاشرے کے غلط اور فرسودہ خیالات کے خلاف سوچتی ہے۔ مثلاً لڑکے، لڑکیوں سے بہتر ہیں اور لڑکیاں وہ کام نہیں کر سکتیں جو لڑکے کر سکتے ہیں۔

جانوروں سے پیار کرنے والی بہادر لڑکی فرح نے اپنی ہمت کے مطابق اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا۔ ایک ایسے موقع پر جہاں بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں بہادر لڑکی فرح کس طرح تمام مشکل حالات سے نبرد آزما ہوئی؟

جنگلی جانوروں کے تحفظ اور خواتین کے مثبت اور باہمت کردار کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی یہ کہانی یقیناً بچوں، اساتذہ اور والدین کے لئے تفریح اور پُر لُطف مطالعے کا باعث ہو گی اور اس سے کئی تدریسی مقاصد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

DFID Department for International Development

فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور راولپنڈی کراچی

PMSP Punjab

969 0 01632 6